نام کتاب	:	تحریک آزادی کے ایک عظیم قائد
مصنف	:	مفتی محمد شمشاد ندوی (مدرس، مصنف، صحافی، داعی)
سن اشاعت	:	۲۰۱۲
ایڈیشن	:	اوّل
تعداد	:	ایک ہزار
صفحات	:	۷
سائز	:	23x36
قیمت	:	
کمپوزنگ	:	القلم کمپیوٹرس، رام گنج، جے پور (راجستھان)
ناشر	:	الکریم اسلامک اکیڈمی، شیوہر بہار

تحریک آزادی کے ایک عظیم قائد

سرزمین ہند پر مسلمانوں کے آٹھ سالہ عدل و انصاف، اتحاد و اتفاق اور مذہبی رواداری پر مبنی دورِ حکومت کے بعد انگریزوں کی ظالمانہ حکمرانی کا دور شروع ہوا اور مغربی تہذیب و ثقافت کا مہیب بادل پورے ملک پر چھا گیا، اس تہذیب و ثقافت کی یلغار سے ہندوستانی تہذیب خصوصاً اسلامی تہذیب وقوانین کو شدید دھچکا لگا۔ مسلمانوں کو اپنی حکومت کے خاتمہ اور ان کے مظالم کی انتہا ہی کیا کم تھی کہ عائلی قوانین میں مداخلت نے ان کے غم و غصہ کو دوآتشہ کر دیا، چنانچہ علماء کرام نے ملک کی آزادی کی صدا بلند کرنے میں سبقت کی اور اس کی خاطر انہوں نے جان و مال، عزت و آبرو اور ملازمت و مراعات کی قطعاً پرواہ نہیں کی۔ علماء عظام کی ثابت قدمی، مقصد کے حصول کی تمنا اور اس ملک کو انگریز کے ناپاک قدموں سے پاک کرنے کی جہد و سعی کی راہ میں انگریز حکومت کی بربریت و سفاکیت، پھانسی کے پھندے، گولیوں کی بوچھار، جائیداد کی ضبطی و نیلامی اور قید و بند کی صعوبتیں حائل نہیں ہوئیں اور ان کی قیادت و سرپرستی میں مسلمانوں نے بھی جو عدیم المثال قربانیاں پیش کیں اس کی داستان تاریخ کا وہ انمول حصہ ہے جو سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے، لیکن افسوس کہ ان مجاہدین کے کارناموں کو اغیار نے فراموش کیا، ہماری نئی نسل بھی اپنی سنہری تاریخ کو بھولتی جارہی ہے۔

آج ملک میں منظّم طریقے سے ایک فرضی تاریخ مرتب کی جارہی ہے، جس میں مسلم سلاطین، علمائے عظام اور مدارسِ اسلامیہ کے خلاف زہرافشانی کی جارہی ہے۔ نصاب میں فرضی داستاں کی شمولیت، نام نہاد تحقیقی اداروں کی جانب سے کتابوں کی مسلسل اشاعت، سیاسی و سماجی کارکنوں کے بیانات وانٹرویوز تک یہ معاملہ محدود نہیں ہے، بلکہ ذرائع ابلاغ کی پوری قوت اس راہ میں صرف کی جارہی ہے۔

ان حالات میں ہم پر اپنی نئی نسل کو مدارسِ اسلامیہ اور علماء کرام کے کارناموں سے آگاہ

کرتے ہوئے برادرانِ وطن کے سامنے ہندوستان کی اصل تاریخ خصوصاً تحریک آزادی میں ان کی بے مثال قربانیوں کو پیش کرنے کی دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے، تو آیئے آج ہم مجاہدین آزادی کے ایک عظیم قائد سید الطائفہ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی کی سیاسی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں۔ شاہ معین الدین احمد ندوی ''حیاتِ سلیمان'' میں آپ کی سیاسی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ان کا اصل ذوق علمی تھا، وہ عملی سیاست کے آدمی نہ تھے، لیکن ان کی جیسی شخصیت کا اہم تحریکوں سے دامن بچانا مشکل تھا اور خود مسلمانوں کے مصالح ان کو ان کی شرکت پر مجبور کرتے تھے۔ اس لیے اس دور کی تمام قومی اور سیاسی تحریکوں میں ان کا نمایاں حصہ رہا ہے اور مسلمانوں کا کوئی کام خواہ وہ ملکی و ملی ہو یا مذہبی و سیاسی ان کی شرکت سے خالی نہ ہوتا تھا۔ اس لیے ان کے کام اتنے متنوع اور گوناگوں ہیں کہ ان کا سمٹنا آسان نہیں ہے۔(۱)

دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ:

''........ایک ایسے زمانہ میں جب پورے ملک میں آگ لگی ہوئی تھی، سید صاحب کی جیسی شخصیت خاموش نہیں بیٹھ سکتی تھی اور نہ صرف مسلمانوں بلکہ ان کے لیڈروں کی نگاہیں بھی ان کی جانب اٹھتی تھیں اس لیے وہ سیاست سے کنارہ کش بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ چنانچہ علمی کاموں کی غیر معمولی مشغولیتوں کے باوجود وہ سیاسی کاموں کے لیے بھی وقت نکالتے تھے''۔(۲)

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اپنی معروف کتاب ''پرانے چراغ'' میں رقم طراز ہیں:........''اس درسگاہ کے سب سے نمایاں اور کامیاب طالب علم مولانا سید سلیمان ندویؒ تھے جنہوں نے نصف صدی سے زیادہ علماء کی اس قدیم جامعیت کو زندہ اور نمایاں رکھا اور دینی و علمی و ادبی حلقوں میں بیک وقت نہ صرف بازیاب بلکہ اکثر صدرنشین رہے، ان کی زندگی کی اور وہ مختلف ذمہ داریاں جو انہوں نے مختلف وقتوں میں سنبھالیں خود ان کی جامعیت کا ثبوت ہیں۔ وہ ایک زمانہ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے استاد اور الندوہ کے نائب ایڈیٹر نظر آتے ہیں، پھر ''الہلال'' جیسے عہد آفریں صحیفہ کے شریکِ ادارت اور مشہد اکبر جیسے زندہ جاوید مقالہ کے مضمون نگار ہیں۔ جس نے سارے ملک میں جوش وحمیت کی ایک لہر پیدا کر دی تھی۔ اس عرصہ میں

جب مجلس خلافت مولانا محمد علی کی سرکردگی میں اپنا وفد انگلستان بھیجنا طے کرتی ہے تو اس کی رکنیت اور مسلمانانِ ہند کی دینی نمائندگی کے لیے اس کی نظرِ انتخاب اسی نوجواں پر پڑتی ہے۔ دفعتاً وہ اپنے مربی واستاد (مولانا شبلی) کا معاون ورفیق نظر آتا ہے اور ان کے انتقال کے بعد مجلس دارالمصنفین کا ناظم وروحِ رواں اور ''معارف'' جیسے بلند پایہ رسالہ کا مدیر اور دار العلوم ندوۃ العلماء کا معتمد دکھائی دیتا ہے۔ مجلس خلافت سلطان ابن مسعود کی دعوت پر موتمر اسلامی میں شرکت اور مسلمانانِ ہند کے خیالات کی ترجمانی کے لیے ایک وفد مرتب کرتی ہے تو اس کی قیادت کے لیے اس سے زیادہ موزوں شخص نظر نہیں آیا جو عالمِ اسلام کے اس نمائندہ ومنتخب مجمع میں عربی میں اظہارِ خیال کی قدرت رکھتا ہو اور مسلمانانِ ہند کی دینی عظمت کا نقش قائم کر سکے........ پھر اس پورے عرصے میں ہم ان کو کانگریس کے مخصوص جلسوں میں شرکت کرتے اور خلافت وجمعیۃ علماء کی سالانہ جلسوں کی صدارت کرتے دیکھتے ہیں۔ ہر جگہ ان کی رائے کا وزن، ان کی شخصیت کا وقار اور ان کی واقفیت کا اعتراف پاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ مسلم ایجوکیشن کانفرنس، جامعہ ملیہ اسلامیہ، انجمن ترقی اردو اور ہندوستان اکیڈمی ان کے گرانقدر خطبات ومقالات سے مالا مال ہے۔ پھر ان تمام مصروفیتوں اور سفروں میں ان کے علمی انہماک وتصنیفی تسلسل میں فرق نہیں آتا۔ اور اسی عرصہ میں ان کی وہ محققانہ کتابیں شائع ہوتی ہیں، جن کو پڑھ کر بالکل اندازہ نہیں ہوتا کہ ان کا مصنف ملک کی سیاسی زندگی میں شریک اور ملک کے انقلابی تقاضوں اور امنگوں کو سمجھنے والا اور ان کا ساتھ دینے والا ہے''۔(۳)

آپ کی سیاسی خدمات کا آغاز ''الہلال'' کے پُرجوش مضامین سے ہوتا ہے۔ ''الہلال'' میں مضمون نگار کا نام نہیں ہوتا تھا اس لیے اس کے بہت سے مضامین ابوالکلام آزاد کی طرف منسوب ہو گئے (۴) مسجد کانپور کی شہادت اور بے گناہ لوگوں اور معصوم بچوں پر فائرنگ کے بعد آپ نے ایک پُرجوش وولولہ انگیز مضمون ''الہلال'' میں لکھا۔ اس مضمون نے جہاں آزادی کی ایک نئی لہر پیدا کر دی اور پورا ملک آزادی کے نعروں سے گونج اُٹھا، وہیں انگریزوں کی نیند حرام ہو گئی، انگریز حکومت نے ''الہلال'' کے اس شمارہ کو ضبط کر لیا۔

سید صاحب کے اس مضمون کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''زمین پیاسی ہے، اس کو خون چاہیے لیکن کس کا؟ مسلمانوں کا، طرابلس کی زمین کس کے خون سے سیراب ہے؟ مسلمانوں کے، مغربِ اقصیٰ کس کے خون سے رنگین ہے؟ مسلمانوں کے، خاکِ ایران پر کس کی لاشیں تڑپتی ہیں؟ مسلمانوں کی، سرزمینِ بلقان میں کس کا خون بہتا ہے؟ مسلمانوں کا، ہندوستان کی زمین بھی پیاسی ہے، خون چاہتی ہے کس کا؟ مسلمانوں کا۔ آخر کار سرزمین کانپور پر خون برسا اور ہندوستان کی خاک سیراب ہوئی....''

مسلم ہستی تو اب کہاں بسے گی؟ کہ تیرے لیے ہندوستان بھی امن کا گھر نہیں رہا، وہ جس کو تو سب سے بڑی اسلامی حکومت کہتی تھی، وہ بھی تیرا خون مانگتی ہے لیکن دشمنی سے نہیں، محبت سے، وہ تیری محبت اور وفاداری کا امتحان لیتی ہے۔ ع

''سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی''

''.......برٹش حکومت کہتی ہے کہ رعایا کے مذہب کا احترام ہوگا، لیکن کیا وہ اس سے بھی کم ہوگا جتنا ایک سڑک کے سیدھے ہونے کا، برٹش حکومت کہتی ہے کہ رعایا کے خون کا احترام ہوگا لیکن کیا اس سے بھی کم جتنا کہ ایک راستہ کی زینت وآرائش کا؟.........وہ کیا عجب منظر تھا جب کربلائے کانپور میں کئی ہزار بے دست وپا رعایا، برہنہ سر، برہنہ پا، باچشمِ نم، بادلِ پُرغم، ایک سیاہ علم کے نیچے جو اسلام کی مظلومی وبے کسی کا نشان تھا، کئی سو معصوم بچوں کے ساتھ، چند اینٹوں اور پتھروں کا ڈھیر لگا رہی تھی اور اس کی زبان پر وہ دعا جاری تھی جو وقتِ تعمیر کعبہ ابراہیم واسمٰعیل کی زبان پر جاری تھی ﴿ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم﴾ پروردگار! اپنے گھر کے لیے ہماری ان چند اینٹوں کو قبول کر، تو سن رہا ہے، جان رہا ہے۔

یہ پُراثر مقدس نظارہ ختم نہیں ہوا تھا کہ مسٹر ٹائلر (مجسٹریٹ کانپور) کی سپہ سالاری میں ایک مختصر سوار اور پیدل فوج تمام اسلحہ سے مسلح نمودار ہوتی ہے اور دس منٹ تک اپنی بندوقوں سے اُڑا اُڑا کر گولیوں کی ایک چادر ہوا میں پھیلا دیتی ہے، پردہ چاک ہوتا ہے، میدان میں خاک وخون میں تڑپتی ہوئی لاشیں نظر آتی ہیں، جن میں بعض معصوم جانیں بھی ہیں جو افسوس دم توڑ چکیں''۔(۵)

ترکِ موالات کی تحریک کو آپ نے جس طرح اپنے سحر بیان تحریر وتقریر کے ذریعہ قوت و

دوام بخشا اسی طرح آپ نے حکومت کی جانب سے ندوۃ العلماء کو ملنے والی پانچ سو ماہوار ایڈ کی واپسی کا فیصلہ فرما کر اس تحریک میں عملی طور پر بھی حصہ لیا۔ حالانکہ اس وقت دارالعلوم ندوۃ العلماء اس ایڈ کی واپسی کا متحمل نہیں تھا، آپ نے اس کی تلافی اپنے عقیدتمندوں کی امداد سے کر لی (۶) آپ بہترین لباس زیب تن کیا کرتے تھے، لیکن اس تحریک کے بعد کھدر پوش ہو گئے تھے۔

چند اکابرین اور مسلمانوں کا ایک طبقہ تقسیم ہند کا مخالف تھا، ان میں سید صاحب کی ذاتِ اقدس بھی تھی۔ شاہ معین الدین احمد ندوی لکھتے ہیں کہ........"اگرچہ وہ اکثریت کی ذہنیت سے مایوس تھے لیکن تقسیم کے بعد یہاں کے مسلمانوں کی پوزیشن کا پورا احساس تھا، اس لیے وہ تقسیم کے حامی نہ تھے، اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اگر ہندوستان تقسیم ہو گیا تو یہاں کے مسلمانوں کا انجام کیا ہوگا"۔ (۸)

بڑی قربانیوں کے بعد ظلم و ستم، مصائب و آلام اور غلامی و بے بسی کی رات ختم ہوئی اور آزادی کی کرن نمودار ہوئی۔ لیکن آزادی کی صبح جس سے مسلمانوں کو بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں بھیانک ثابت ہوئی، تقسیم ہند کے بعد پورا ملک بے گناہوں کے خون سے لالہ زار ہو گیا۔ ان حالات میں چند اکابرین و ہمدردانِ ملت میں آپ کی ذاتِ مبارکہ بھی تھی جن کی وجہ سے مسلمانوں کی ڈھارس بندھی ہوئی تھی اور وہ مستقبل کے بارے میں پُر امید نظر آرہے تھے۔

آپ کے لیے جہاں ملک کے اہم تعلیمی اداروں کی جانب سے اہم عہدے کے شرفِ قبولیت سے نوازے جانے کی درخواست کی جارہی تھی، وہیں پاکستان کے صدر، وزیر اعظم، قدردانوں، نیازمندوں اور احباب کی جانب سے پاکستان میں قیام کرنے کی درخواست کی جارہی تھی اور ان کو اس بورڈ کا صدر بنایا گیا تھا جس کے ذمہ دستورِ پاکستان کو کتاب و سنت کے مطابق ڈھالنا تھا۔ ادھر حکومت آپ کے قیامِ ہند پر مصر تھی، خصوصاً پنڈت جواہر لال نہرو آپ کا بڑا لحاظ و احترام کرتے تھے۔ ان کو آپ کا پاکستان جانا قطعاً پسند نہ تھا۔ تقسیم ہند کے بعد ہجرت نہ کرنے اور اپنے ملک ہی میں بقیہ زندگی گزار دینے کا عزم مصمم کر چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اپنے وطن میں ایک خوبصورت مکان بنوایا تھا اور اپنے استاذ علامہ شبلی کے قریب اپنی قبر کے لیے جگہ بھی متعین فرما لی تھی، لیکن اللہ کا فیصلہ کچھ اور تھا۔ تقسیم ہند کے بعد آپ نے صاحبزادی و داماد، عقیدتمندوں،

قدردانوں اور احباب سے ملاقات کے لیے پاکستان کا سفر کیا تھا، وہاں مستقل قیام کا ارادہ نہیں تھا، لیکن ایسے حالات پیدا ہو گئے (جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں) جن کی وجہ سے ان کا عارضی قیام دائمی قیام میں تبدیل ہو گیا، اور ۱۹۵۰ء میں اپنے اہل و عیال کو بھی کراچی بلا لیا۔ اس گنج گرانمایہ کے قیامِ پاکستان کی خبر ان کے ہندوستانی عقیدت مندوں، قدردانوں اور احباب کے لیے صدمہ و تکلیف کا باعث ہوا اور انہوں نے اسے قومی حادثہ قرار دیا، لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ سید صاحب کا سب کچھ ہندوستان میں تھا، آبائی وطن دیسنہ، دارالمصنفین اور ندوۃ العلماء کے علاوہ اعزا و اقارب، دوست و احباب، قدردانوں اور عقیدتمندوں کا ایک بڑا حلقہ ہندوستان ہی میں تھا۔ اس لیے جسم تو پاکستان میں رہا لیکن دل و دماغ ہندوستان ہی میں رہا۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ اور دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی ہمیشہ فکر دامن گیر رہی اور ان کی ترقی و استحکام کے لیے کوشاں رہے۔ ایسا کیوں نہ ہوتا جب کہ آپ نے ان دونوں اداروں کو خونِ جگر سے سینچا تھا۔ آپ کا ہندوستان سے مستقل رابطہ رہا اور باشندگانِ ہند بھی اپنے تمام اہم کاموں میں آپ سے صلاح مشورہ کرتے رہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ اب ان کے علوم و معارف اور فیوض و برکات سے پاکستان زیادہ مستفید ہو رہا تھا۔ لیکن یہ سلسلہ بھی زیادہ مدت تک قائم نہیں رہا کہ جنت کی طرف ہجرت کا وقت آ گیا اور ایک مومن کا اصل ٹھکانہ تو جنت ہی ہے۔ یہ آپ کی آخری ہجرت تھی جس کی فکر و تیاری میں زندگی کا ایک ایک لمحہ گزر رہا تھا۔

مراجع:

۱۔ حیاتِ سلیمان ص۱۷۲، مؤلفہ شاہ معین الدین احمد ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ (یوپی)

۲۔ ایضاً ص۲۱۸

۳۔ پرانے چراغ، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ ج۱ص۴۳،۴۴،۵۴۔ مکتبہ فردوس، مکارم نگر، لکھنؤ

۴۔ حیاتِ سلیمان ص۶۲ ۵۔ ایضاً ص۵۹تا۶۱ ۶۔ ایضاً ص۲۱۹

۷۔ ایضاً ص۶۰۵ ۸۔ ایضاً ص۵۴۶

☆☆☆